© rasailojaraid.com

نام کتاب : ایک علمی وفکری مکالمہ

شرکاء : ابوعمار زاہد الراشدی/معز امجد/خورشید ندیم/ڈاکٹر فاروق خان

تقسیم کنندہ : دار الکتاب، غزنی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

ناشر : الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ

اشاعت اوّل : فروری ۲۰۰۷ء

قیمت : ۱۵۰ روپے

تبصرہ نگار : حافظ مبشر حسین لاہوری*

زیر نظر کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، ایک علمی و فکری تحریری مکالمہ ہے جو دو فریقوں کے درمیان اخبار وجرائد کے صفحات پر کئی ماہ تک جاری رہنے کے بعد کتابی شکل میں شائع کر کے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اس مکالمہ کے ایک فریق مولانا زاہد الراشدی صاحب ہیں جو ایک معروف مذہبی وعلمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اور خود بھی صاحب علم و فکر اور معروف قلم کار و تجزیہ نگار ہیں۔

دوسرے فریق میں معروف دانشور اور مولانا فراہیؒ و اصلاحیؒ صاحبان کے مکتب فکر سے نسبت رکھنے والے محترم جاوید احمد غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ ورفقاء (یعنی معز امجد/خورشید ندیم/ڈاکٹر فاروق خان) شامل ہیں۔ چونکہ جاوید غامدی صاحب کی طرف سے ان کے موقف پر راشدی صاحب کی طرف سے ہونے والے نقد کے جواب دینے کی ذمہ داری غامدی صاحب کی بجائے ان کے تلامذہ ورفقاء نے انجام دی ہے، اس لیے کتاب کے سرورق پر غامدی صاحب کے انہی اصحاب کا نام تحریر کیا گیا ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں محترم راشدی صاحب لکھتے ہیں:

> ''ہم نے اسی جذبہ اور خیال کے تحت محترم جاوید احمد غامدی کے بعض افکار پر نقد کیا تھا جس کا ان کے بعض شاگردوں نے جواب دیا اور اس طرح ایک مکالمہ کی فضا بن گئی۔ یہ بحث جنوری ۲۰۰۱ء سے اپریل ۲۰۰۱ء تک ابتداءً روزنامہ 'اوصاف'، روزنامہ 'جنگ' اور روزنامہ 'پاکستان' کے صفحات پر چلتی رہی اور بعد میں ماہنامہ 'الشریعۃ' اور ماہنامہ 'اشراق' میں

☆ ریسرچ ایسوسی ایٹ/لیکچرر، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی اس سلسلے میں بعض مضامین شائع ہوئے۔ بعض دوستوں کا خیال ہے [کذا] کہ اس مکالمہ کے دونوں طرف کے مضامین کو یکجا شائع کر دیا جائے تاکہ قارئین کو متعلقہ مسائل پر رائے قائم کرنے میں آسانی ہو، چنانچہ یہ مضامین قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ اس مجموعے میں غامدی صاحب کے افکار کے جائزہ پر مبنی بعض دیگر مضامین بھی تکملہ کے طور پر شاملِ اشاعت ہیں''۔ دیکھیے: کتاب مذکور، ص۸۔

زیر نظر کتاب میں غامدی صاحب پر نقد کے حوالے سے بنیادی طور پر درج ذیل موضوعات زیر بحث آئے ہیں:

۱۔ علمائے دین اور سیاست
۲۔ حکومت وقت کی طرف سے زکوٰۃ کے بعد کسی ٹیکس کا مطالبہ
۳۔ جہاد اور حکومت واقتدار کا مسئلہ
۴۔ علما اور فتویٰ بازی
۵۔ حدیث وسنت اور غامدی صاحب کا نقطہ نظر
۶۔ حدود آرڈیننس اور اس پر اعتراضات
۷۔ قرآن فہمی میں حدیث نبویؐ کی اہمیت (غلام احمد پرویز اور جاوید احمد غامدی صاحب کا نقطہ نظر)
۸۔ اسلام میں پردہ کے احکام
۹۔ پارلیمنٹ، اجتہاد اور وفاقی شرعی عدالت (کے بارے میں غامدی صاحب کے خیالات)

ہمارے نزدیک اس کتاب کی اہمیت کئی پہلوؤں سے ہے مثلاً:

۱۔ اس میں اٹھائے گئے سبھی مباحث دور حاضر کے زندہ اور عملی مسائل ہیں۔
۲۔ سبھی شرکاء نے اپنی حد تک پوری محنت اور دیانت کے ساتھ اپنے اپنے موقف پر دلائل پیش کیے ہیں۔
۳۔ نقد و نظر کا یہ سلسلہ اپنے دامن میں طنز و تشنیع کے نشتر لیے ہوئے نہیں ہے، بلکہ نہایت شائستگی اور افہام وتفہیم کا جذبہ اس کے پیچھے کارفرما نظر آتا ہے اور اس کا اعتراف ہر شریک نے (مثلاً خورشید ندیم، ص۲۳ پر، معز امجد، ص۵۱ پر، منظور الحسن، ص۱۷۱ پر) کیا ہے۔ یہ بات اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ہمارے ہاں اکثر وبیشتر علمی و مذہبی حلقوں میں اختلافی مسائل پر رواداری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

و احترام رائے کی بجائے متعصّبانہ سوچ، مناظرانہ اسلوب، اور غصہ و نفرت کا شدید سے شدید تر اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔ تحریروں کا آغاز بھی بعض اوقات تضلیل و تکفیر سے ہوتا ہے اور مناظروں/مباحثوں کا اختتام بھی گالی گلوچ اور ہاتھا پائی پر۔ اسلامی تاریخ میں علماء و فقہاء کے ہاں فقہی اختلافات میں جو علمی شائستگی وتہذیب 'الرد علی سیر الاوزاعی'، 'الحجۃ علی اھل المدینۃ' اور 'کتاب الام' وغیرہ میں دیکھنے کو ملتی ہے، آج کے دور میں اس کا نمونہ خال خال ہی دکھائی دیتا ہے۔ ان حالات میں زیر نظر کتاب میں دونوں فریقوں کی طرف سے اختیار کیا گیا علمی اسلوب کم از کم مجھ سمیت ان سب لوگوں کے لیے یقیناً مشعل راہ ہے جو اختلافی مسائل پر اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں۔

۴۔ اختلافی مسائل میں فریقِ مخالف کی رائے کو اس کی اپنی تحریروں اور بیانات (آراء و اقوال) سے سمجھنا، اس کے دلائل کو پوری دیانت داری سے ذکر کرنا اور پھر اس پر علمی اسلوب میں نقد کرنا ہمارے ہاں شاید عنقا ہوتا جا رہا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو ایسے لطیفے سامنے آتے ہیں کہ ایک عرصہ تک دونوں طرف اختلاف چلتا رہتا ہے، آخر میں پتہ چلتا ہے کہ دونوں فریق ایک ہی بات کہہ رہے ہیں، بس لفظی نزاع تھا کوئی حقیقی اختلاف نہیں تھا۔

مولانا راشدی صاحب نے فریق مخالف کے نقطۂ نظر کو پوری طرح سمجھنے کے بعد ہی نقد کیا ہے، اور اس سلسلہ میں کوئی ایسی بات ان کی طرف منسوب نہیں کی جو انہوں نے نہیں کہی یا جو ان کے نقطۂ نظر سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس بات کا اعتراف دوسرے فریق نے بھی کیا ہے، چنانچہ منظور الحسن صاحب ان کے بارے میں لکھتے ہیں: ''کسی پر نقد و تبصرہ مقصود ہو تو ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ اس کی بات کو اسی کے ماخذ سے اور اسی کے مفہوم کے مطابق لیا جائے''۔ ص۲۷۱۔

منیر احمد چغتائی نامی ایک صاحب نے راشدی صاحب کے نام اپنے ایک مراسلہ میں لکھا کہ ''غامدی صاحب جہاد کے بارے میں قادیانیوں کے موقف کے موید ہیں'' تو اس پر راشدی صاحب لکھتے ہیں: ''یہ سراسر زیادتی ہے اس لیے کہ ان کا موقف قطعاً وہ نہیں ہے جو مرزا غلام احمد قادیانی نے پیش کیا ہے۔ مرزا قادیانی نے جہاد کے سرے سے منسوخ ہونے کا اعلان کیا تھا بلکہ اس نے جھوٹی نبوت کا ڈھونگ ہی جہاد کی منسوخی کے پرچار کے لیے کیا تھا جبکہ غامدی صاحب جہاد کی فرضیت اور اہمیت کو پوری طرح تسلیم کرتے ہیں البتہ جہاد کے اعلان کی مجاز اتھارٹی کے بارے میں تحفظات رکھتے ہیں مگر اس بارے میں ان کی رائے امت کے جمہور اہل علم سے مختلف ہے''۔ ص۱۵۰۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علمی و فکری حلقوں میں جناب جاوید احمد غامدی صاحب کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علمی و فکری صلاحیتوں سے نوازا ہے، اپنے علم و فکر کی نشر و اشاعت کی لگن، جذبہ اور محنت نے ان کے گرد ایک حلقۂ علم وارادت بھی جمع کر دیا ہے، تاہم ان کے ہاں بہت سے تفردات بھی پائے جاتے ہیں جنہیں نہ صرف یہ کہ وہ تسلیم کرتے بلکہ ان پر غالباً فخر بھی کرتے ہیں اور اسے اپنے فکری ارتقاء اور عدم تعصب کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ یہ تفردات اصولی بھی ہیں اور جزئی بھی، اصولی زیادہ اور جزئی کم ہیں مگر ان کے نتائج چونکہ جزئیات میں ظاہر ہوتے ہیں، اس لیے جزئی پہلو غالب دکھائی دیتا ہے۔ میری طالب علمانہ رائے میں اصل بات اصولی تفردات کو ترجیحاً موضوعِ بحث بنانے کی ہے، ورنہ جزئیات میں بحث چھیڑ کر فیصلہ اور حتمی رائے قائم کرنے کا اختیار عام قاری کے سپرد کر دینا شاید ناانصافی ہو۔ زیرِ نظر کتاب اس پہلو سے تشنہ ہے، اس لیے کہ اس میں چند اصولی باتوں کے علاوہ باقی سبھی باتیں جزئیات کی قبیل سے ہیں اور فیصلہ قارئین کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ مولانا راشدی صاحب نے خود اس امر کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

> ''یہ مضامین صرف چند مسائل کے حوالے سے ہیں جبکہ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ محترم غامدی صاحب کے افکار کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔ خدا کرے کہ فرصت اور توفیق کے کچھ لمحات ایسے میسر آ جائیں'' ص۹۔

جاوید احمد غامدی صاحب کی فکر اور تفردات کے حوالے سے راشدی صاحب جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، اس کا اندازہ ان کے درج ذیل اقتباسات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے:

> ''[فکر اسلامی میں اجتہاد اور تجدید کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں]'اجتہاد' کا تعلق اسلام کے مستقبل سے ہے اور 'تجدید' اس کے ماضیٔ قدیم کی حفاظت کا عنوان ہے۔ البتہ گزشتہ چند صدیوں سے تجدید اور اجتہاد کے ساتھ ساتھ ایک نئی اصطلاح اسلام کی تعبیر نو اور اسلامی علوم کی تشکیل نو کے عنوان سے سامنے آ رہی ہے جس کا وجود اسلامی تاریخ کے پہلے ہزار سال میں نہیں ملتا، مگر اب اسے اجتہاد اور تجدید کے متبادل بلکہ نعم البدل کے طور پر پیش کرنے کے لیے بہت سے ارباب دانش کی صلاحیتیں مسلسل صرف ہو رہی ہیں، حالانکہ یہ ان دونوں سے قطعی مختلف بلکہ متضاد چیز ہے'' ......ص۶۔

> ''غامدی صاحب نے جس انداز سے دین کی بنیادی اصطلاحات کی تشکیل نو کی ہے اور اصطلاحات کے الفاظ کو برقرار رکھتے ہوئے ان کے مفہوم و مصداق کے حوالے سے جو نیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تانا بانا ہے، وہ اجتہاد اور تجدید کے قدیمی اور روایتی مفہوم کے بجائے تشکیل نو (Reconstruction) کے دائرے میں آتا ہے۔ ہمارا ان سے اصولی اختلاف یہی ہے اور ہم پورے شرح صدر اور دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں بھی دین کے پورے ڈھانچے کی تشکیل نو کی بات ہو گی، دین کی بنیادی اصطلاحات کو نئے معانی دے کر اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی اور امت کے چودہ سو سالہ علمی ماضی کے خلاف بے اعتمادی کی فضا پیدا کر کے نئی نسل کو اس سے کاٹنے کی سوچ کارفرما ہو گی، وہاں ایسی کوششوں کا عملی نتیجہ گمراہی کا ماحول پیدا کرنے کے سوا کچھ برآمد نہیں ہو گا''۔ ص۸۔

''میں انہیں [غامدی صاحب کو] حضرت مولانا حمید الدین فراہی کے علمی مکتب فکر کا نمائندہ سمجھتا ہوں اور حضرت مولانا فراہیؒ کے بارے میں میری رائے وہی ہے جو حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ہے، البتہ امت کے جمہور اہل علم کے علی الرغم ان کے تفردات کو میں قبول نہیں کرتا اور غامدی صاحب سے میں نے یہی عرض کیا ہے کہ علمی تفردات کو اس انداز سے پیش کرنا کہ وہ امت کے اجتماعی دھارے سے الگ کسی نئے مکتب فکر کا عنوان نظر آنے لگیں، امت میں فکری انتشار کا باعث بنتا ہے اور اگر اس پر اصرار کیا جائے تو اسے عالمی فکری استعمار کی ان کوششوں سے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے جو ملت اسلامیہ کو ذہنی انتشار اور فکری انارکی سے دوچار کرنے کے لیے ایک عرصہ سے جاری ہیں''۔ص۱۵۰۔

''تفردات کے بارے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ یہ ہر صاحب علم کا حق ہے جس کا احترام کیا جانا چاہیے بشرطیکہ وہ ان کی ذات یا حلقے تک محدود رہے۔ البتہ اگر کسی ''تفرد'' کو جمہور اہل علم کی رائے کے علی الرغم سوسائٹی پر مسلط کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ فکری انتشار اور ایک نئے مکتب فکر کے قیام کا سبب بنتا ہے اور یہی وہ نکتہ اور مقام ہے جہاں ہمارے بہت سے قابلِ قدر اور لائقِ احترام مفکرین نے ٹھوکر کھائی ہے اور امت کے ''اجتماعی دھارے'' سے کٹ کر جداگانہ فکری حلقوں کے قیام کا باعث بنے ہیں''۔ ص۱۲۔

اب ہم زیر نظر کتاب کے مندرجات کے سلسلہ میں بالترتیب فریقین کے موقف اور ان پر کچھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تبصرہ پیش کرتے ہیں۔

ا۔ علماء اور سیاست

علماء کو عملی سیاست میں حصہ لینا چاہیے یا نہیں، اس سلسلہ میں غامدی صاحب کی رائے یہ نقل کی گئی ہے:

''علمائے کرام خود سیاسی فریق بننے کے بجائے حکمرانوں اور سیاست دانوں کی اصلاح کریں تو بہتر ہو گا۔ مولوی کو سیاست دان بنانے کے بجائے سیاست دان کو مولوی بنانے کی کوشش کی جائے''۔ ص۱۳۔

اس پر راشدی صاحب نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ موقع محل اور حالات کی مناسبت کی بات ہے اور دونوں طرف اہل علم اور اہل دین کا اسوہ موجود ہے۔ امت میں اکابر اہل علم کا ایک بہت بڑا طبقہ ہے جس نے حکمرانوں کے خلاف سیاسی فریق بننے کے بجائے ان کی اصلاح اور رہنمائی کا راستہ اختیار کیا ہے لیکن ایسے اہل علم بھی امت میں رہے ہیں جنھوں نے اصلاح کے دوسرے طریقوں کو کامیاب نہ ہوتا دیکھ کر خود فریق بننے کا راستہ اختیار کیا ہے اور اس سلسلے میں سب سے بڑی مثال حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ ہیں جن کا شمار صغار صحابہؓ میں ہوتا ہے اور وہ بنیادی طور پر اہل علم میں سے تھے لیکن حضرت امیر معاویہؓ کے بعد انہوں نے یزید کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا اور صرف انکار نہیں کیا بلکہ خود اس کے خلاف فریق بن گئے اور متوازی حکمران کے طور پر کئی برس تک حجاز اور دوسرے علاقوں پر حکومت کرتے رہے۔ اس لیے اگر کسی دور میں علمائے کرام یہ سمجھیں کہ خود فریق بنے بغیر معاملات کی درستی کا امکان کم ہے تو اس کا راستہ بھی موجود ہے اور اس کی مطلقاً نفی کر دینا دین کی صحیح ترجمانی نہیں ہے''۔ص۱۴۔

راشدی صاحب پر نقد اور غامدی صاحب کے موقف کی توضیح کرتے ہوئے ان کے شاگردِ رشید جناب خورشید ندیم صاحب لکھتے ہیں:

''کیا علماء کو عملی سیاست میں حصہ لینا چاہیے؟ اس سوال کا جواب تلاش کرتے وقت دو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باتیں پیش نظر رہنا چاہییں۔ ایک تو یہ کہ یہ شریعت کا نہیں ، حکمت و تدبر کا معاملہ ہے۔ یہ جائز اور ناجائز کی بحث نہیں ہے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ شریعت نے علماء کو سیاست میں حصہ لینے سے روک دیا ہے یا انہیں اس کے لیے حکم دیا ہے۔ جب ہم اس سوال کو موضوع بناتے ہیں تو ہمارے پیش نظر محض یہ ہے کہ اس سے دین اور علماء کو کوئی فائدہ پہنچا ہے یا نقصان۔دوسری بات یہ ہے کہ عملی سیاست سے ہماری مراد اقتدار کی سیاست (Power Politics) ہے، یعنی اقتدار کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا یا کسی کے عزل و نصب کے لیے کوئی عملی کردار ادا کرنا''۔ ص۲۶۔

اس کے بعد خورشید صاحب نے چند عملی مثالوں کے ساتھ اس بات کا تجزیہ کیا ہے کہ ''علماء کی سیاست کا دین کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچا''۔ ص۲۹۔ اس تجزیے کے اختتام پر حاصل بحث کے طور پر فرماتے ہیں:

''اس تجزیے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں ہو گا کہ اس سے مقصود دین و سیاست کی علیحدگی کی وکالت ہے۔ یہاں محض یہ بات کہی جا رہی ہے کہ علماء کا کام سیاست نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کا کام ہے جو اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے سیاست کا رجحان رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کو اسلامی ریاست ہونا چاہیے اور اس میں بھی دو آرا نہیں کہ اس کے لیے جدوجہد ہونی چاہیے، لیکن ہمارے نزدیک یہ کام وہ لوگ کریں جن کے اندر اس کے لیے فطری داعیہ موجود ہو۔ علماء کا منصب یہ نہیں کہ وہ سیاست دان بنیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ وہ سیاست دانوں کو مسلمان بنائیں''۔ ص۳۴۔

خورشید صاحب کے جواب میں راشدی صاحب لکھتے ہیں:

''جہاں تک علماء کے عملی سیاست میں فریق بننے یا نہ بننے کی بات ہے، انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ یہ جائز و ناجائز کی بات نہیں ہے بلکہ حکمت و تدبیر کا مسئلہ ہے۔ اس لیے اس حوالے سے ان کا موقف اور ہمارے نقطۂ نظر میں کوئی زیادہ فرق نہیں رہا کیونکہ ہم نے بھی ''موقع محل کی مناسبت'' کے عنوان سے ضرورت کے وقت عملی سیاست میں علماء کے فریق بننے کا دفاع کیا تھا جبکہ انہوں نے اسے ''حکمت و تدبیر'' کا نام دے دیا ہے''۔ص۴۱۔

ہمارے خیال میں اگر اس بحث کو [illegible] سے متعلقہ ان مباحث کی روشنی میں دیکھا جائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو غامدی صاحب اور ان کے رفقاء کے ہاں مولانا مودودیؒ ، صدر الدین اصلاحیؒ، مولانا گوہر رحمانؒ وغیرہ جیسے اہل علم کے نقطۂ نظر پر تردید کے ضمن میں سامنے آئے تو اس بحث کا دائرہ ایک ہی جست میں 'حکمت وتدبیر' جسے فریقین یہاں تسلیم کر رہے ہیں، سے نکل کر جائز اور ناجائز، حلال اور حرام کے دائرہ سے جا ملتا ہے۔ یہاں اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے احباب کے لیے یہ امر مزید مطالعہ اور دلچسپی کا باعث ہو گا کہ جناب جاوید احمد غامدی صاحب اور ان کے رفقاء و تلامذہ اس (اقامتِ دین اور اس کی سیاسی وعملی مساعی کے) سلسلہ میں جس موقف پر سخت تنقید کرتے ہیں، ٹھیک وہی موقف غامدی صاحب کے استاذ مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور آگے ان کے استاذ مولانا حمید الدین فراہیؒ کا تھا، جیسا کہ ان دونوں علماء کی تحریروں میں اسے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، بلکہ خود غامدی صاحب کی 'میزان' کے پہلے ایڈیشن (غالباً ۱۹۸۹ء) میں موجود غامدی صاحب ہی کے ایک مقالہ میں یہی فکر جرأت اور بے باکی سے دہرائی گئی ہے، تاہم اب یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ میزان کے اگلے ایڈیشنوں میں اسے حذف کر کے غامدی صاحب نے اپنا یہ موقف بدل لیا ہے۔

خورشید ندیم صاحب نے اس بات کا تجزیہ کرتے ہوئے کہ ''علماء کی سیاست کا دین کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچا''، کے تحت ایک یہ مثال بھی ذکر کی ہے کہ ''اس بات سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ دستور کو اسلامی بنانے اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دلوانے میں بنیادی کردار ایک ایسے عالم دین مولانا ظفر احمد انصاری مرحوم کا تھا جو عملی سیاست سے دور رہنے والے تھے''۔ ص۳۲۔

اس پہلو پر راشدی صاحب نے خورشید صاحب پر مضبوط نقد کیا ہے اور خورشید صاحب اور ان کے بعد ان کے دیگر رفقاء بھی، اس پر مزید کوئی وضاحت یا جواب نہیں دے پائے اور نہ ہی ان میں سے کسی نے اپنے موقف کے اس کمزور پہلو کو تسلیم کیا ہے، راشدی صاحب لکھتے ہیں:

> ''لطف کی بات یہ ہے کہ خورشید ندیم صاحب اس سارے کام کو مولانا ظفر احمد انصاریؒ کے کھاتے میں ڈال کر انہیں عملی سیاست سے دور رہنے والا بزرگ قرار دے رہے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس دور کے دستور سازی کے عمل سے ہی سرے سے بے خبر ہیں۔ مولانا ظفر احمد انصاریؒ کی خدمات اور کردار سے انکار نہیں لیکن وہ دستور ساز اسمبلی اور قومی اسمبلی میں اس ٹیم کا حصہ تھے جس میں مذکورہ بالا اکثر بزرگ شامل تھے اور ان کی قیادت مولانا مفتی محمودؒ کر رہے تھے، جبکہ عملی سیاست سے مولانا ظفر احمد انصاریؒ کے دور رہنے کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ۱۹۷۱ء کے الیکشن میں کراچی سے آزاد امیدوار کے طور پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الیکشن لڑ کر دستور ساز اسمبلی اور پھر قومی اسمبلی کے رکن بنے تھے، اس لیے اگر وہ اس سارے انتخابی عمل سے گزر کر بھی ''عملی سیاست سے دور رہنے والے بزرگ'' قرار پا سکتے ہیں تو مذکورہ بالا دیگر بزرگوں کو یہ سہولت دینے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے''۔ص۴۳۔

۲۔ حکومت وقت کی طرف سے زکوٰۃ کے بعد کسی ٹیکس کا مطالبہ

زکوٰۃ کے بعد کسی ٹیکس کا مطالبہ حکومت کر سکتی ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں غامدی صاحب کا موقف یہ ہے:

''اسلامی ریاست زکوٰۃ کے علاوہ، جس کی شرح اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی وساطت سے مختلف اموال میں مقرر کر دی ہے، اپنے مسلمان شہریوں پر کسی نوعیت کا کوئی ٹیکس بھی عائد نہیں کر سکتی۔''ص۵۶۔

راشدی صاحب کا موقف اس سلسلہ میں یہ ہے:

''یہ درست ہے کہ اگر زکوٰۃ اور دیگر شرعی واجبات کا نظام صحیح طور پر قائم ہو جائے تو معاشرہ کی اجتماعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کوئی اور ٹیکس لگانے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی اور یہ بھی درست ہے کہ ٹیکسوں کا مروجہ نظام سراسر ظالمانہ ہے جس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے، لیکن اگر کسی وقت قومی ضروریات زکوٰۃ اور بیت المال کی دیگر شرعی مدات سے پوری نہ ہوں تو کیا حکومت وقتی ضرورت کے لیے کوئی اور ٹیکس، جائز حد تک لگانے کی مجاز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں ممانعت کی کوئی دلیل ہمارے سامنے نہیں ہے''۔ص۸۲۔

یہ اختلاف فقہاء میں شروع سے رہا ہے، البتہ راشدی صاحب کا موقف اس سلسلہ میں جمہور اہل علم کے ساتھ ہے۔

۳۔ جہاد اور حکومت و اقتدار کا مسئلہ

اس مسئلہ کے بارے میں جناب غامدی صاحب فرماتے ہیں: ''جہاد تبھی جہاد ہوتا ہے جب مسلمانوں کی حکومت اس کا اعلان کرے۔ مختلف مذہبی گروہوں اور جتھوں کے جہاد کو جہاد قرار نہیں دیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جا سکتا''۔ ص۱۴۔

اس رائے پر راشدی صاحب نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہمیں ان کے اس ارشاد سے اتفاق نہیں ہے۔ اس لیے کہ جہاد کی مختلف عملی صورتیں اور درجات ہیں اور ہر ایک کا حکم الگ الگ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی ملک یا قوم کے خلاف جہاد کا اعلان اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ایک اسلامی یا کم از کم مسلمان حکومت اس کا اعلان کرے۔ لیکن جب کسی مسلم آبادی پر کفار کی یلغار ہو جائے اور کفار کے غلبے کی وجہ سے مسلمان حکومت کا وجود ختم ہو جائے یا وہ بالکل بے بس دکھائی دینے لگے تو غاصب اور حملہ آور قوت کے خلاف جہاد کے اعلان کے لیے پہلے حکومت کا قیام ضروری نہیں ہو گا اور نہ ہی عملاً ایسا ممکن ہوتا ہے۔...... اگر جاوید غامدی صاحب محترم کا فلسفہ تسلیم کر لیا جائے تو یہ ضروری ہو گا کہ مسلمان پہلے اپنی حکومت قائم کریں اور اس کے بعد اس حکومت کے اعلان پر جہاد شروع کیا جائے، لیکن پھر یہ سوال اٹھ کھڑا ہو گا کہ جب مسلمانوں نے اپنی حکومت بحال کر لی ہے تو اب جہاد کے اعلان کی ضرورت ہی کیا باقی رہ گئی ہے؟ کیونکہ جہاد کا مقصد تو کافروں کا تسلط ختم کر کے مسلمانوں کا اقتدار بحال کرنا ہے اور جب وہ کام جہاد کے بغیر ہی ہو گیا ہے تو جہاد کے اعلان کا کون سا جواز باقی رہ جاتا ہے؟ ''۔ ص۱۵۔

اس کے بعد راشدی صاحب نے اپنے موقف پر سنت، تعاملِ امت اور معروضی حقائق کی روشنی میں دلائل وشواہد پیش کیے ہیں۔ اس پر معز امجد صاحب اور ڈاکٹر فاروق خان صاحب نے مختلف پہلوؤں سے نقد کیا اور اپنی طرف سے غامدی صاحب کے موقف پر مزید دلائل پیش کیے ہیں، جن کا جواب دینے کی راشدی صاحب نے دوبارہ کوشش کی ہے جب کہ معز امجد اور فاروق خان نے ان کے دلائل سے اتفاق نہیں کیا۔

اس بحث کے دوران فریقین کی طرف سے بنیادی طور پر تین طرح کے دلائل پیش کیے گئے ہیں؛ ایک تو بعض قرآنی آیات ہیں جن کی صحت پر تو ظاہر ہے دونوں فریقوں کا اتفاق ہے، تاہم اس کے معنی ومفہوم متعین کرنے میں اختلاف رائے موجود ہے۔ دوسرے نمبر پر عہد نبویؐ میں یمن کے علاقے میں اسود عنسی کی حکومت کے خلاف حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء کی وہ کارروائی ہے جس کے نتیجے میں اس کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس واقعہ پر غامدی صاحب کے فریق کا نقطۂ نظر یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ یہ ایک کافر کے خلاف قتل کی کاروائی ہے، اسے 'قتال' [یعنی جہاد] نہیں کہا جا سکتا اور دوسری بات یہ کہ اس کی پشت پر نبی کریم ﷺ کی طرف سے رضامندی موجود تھی یعنی مدنی ریاست/حکومت کی اجازت کے ساتھ ہی یہ کارروائی کی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے حافظ ابن حجرؒ کی سیر الصحابہؓ پر معروف کتاب 'الاصابہ فی تمییز الصحابۃ' کے حوالے سے ایک روایت بھی پیش کی ہے جس پر راشدی صاحب نے سخت اور کافی درست تبصرہ کیا ہے، چنانچہ راشدی صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت فیروز دیلمیؓ کے لیے جناب نبی اکرم ﷺ کی اس ہدایت کا ہمیں بھی علم تھا لیکن چونکہ وہ روایت جناب غامدی صاحب کے اصولوں کے مطابق ''خبریت'' کے قابل قبول معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔ اس لیے ہم نے اس کا حوالہ نہیں دیا اور نفسِ واقعہ کا ذکر کر دیا...... ویسے استنباط و استدلال، تعبیر وتشریح اور اصول سازی کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنے کا یہ فائدہ تو ہوتا ہی ہے کہ جس بات پر جی چاہا، اسے قبول کر لیا اور جسے ذہن نے قبول نہ کیا، اس سے انکار کر دیا۔ جی نہ چاہا تو رجم کے بارے میں بخاری اور مسلم کی روایات قابل قبول قرار نہ پائیں اور کہیں ''گیئر'' پھنس گیا تو ''اصابہ'' کی روایت کا سہارا لینے میں بھی کوئی تأمل نہ ہوا''۔ ص۱۱۴،۱۱۵۔

اس سلسلہ میں کچھ اور اہم واقعات بھی کتب احادیث میں روایت ہوئے ہیں جن سے حکومت اور اعلان جہاد کے سلسلہ میں مزید رہنمائی ملتی ہے۔ مگر مذکورہ بالا ایک واقعہ کے علاوہ فریقین نے ان واقعات کو زیر بحث لانا، معلوم نہیں کیوں مناسب نہیں سمجھا۔ انہی میں سے ایک اہم واقعہ جو بخاری و مسلم کی روایات میں بھی ہے، ابو بصیرؓ کا ہے جو صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمان ہو چکے تھے اور کفار مکہ کے زیرِ عتاب تھے، اور معاہدہ صلح کی وجہ سے مکہ سے مدینہ نہیں آ سکتے تھے، مگر یہ مکہ سے بھاگ کر مدینہ آ گئے لیکن نبی کریم ﷺ نے انہیں قریش مکہ کے مطالبے پر ان کے قاصدوں کے حوالے کر دیا۔ یہ ان سے بھی جان بچا کر بھاگ نکلے اور مدنی ریاست سے باہر 'عیص' نامی ایک جگہ پڑاؤ کر لیا اور جو مسلمان کفارِ مکہ کی قید سے بھاگتا، وہ یہاں ابو بصیرؓ کے پاس آ جاتا۔ پھر جب یہاں کچھ لوگوں کا ایک گروپ (عصابہ) اکٹھا ہو گیا تو انہوں نے کفارِ مکہ کے ظلم کے ردِعمل میں ان کے تجارتی قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ بالآخر قریش مکہ نے تنگ آ کر نبی کریم ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ انہیں اپنے پاس بلا لیں اور اب جو بھی مکہ سے آپ کے پاس مدینہ آنا چاہے گا، اسے پر امن طور پر اس کی اجازت ہو گی۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ابو بصیرؓ اور ان کی ٹولی کی طرف پیغام بھیج کر انہیں مدینہ بلا لیا مگر ان کی چھاپہ مار کارروائیوں پر ان کی کوئی سرزنش نہ فرمائی۔ (تفصیلات کے لیے دیکھیے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فتح الباری، ج ۷، ص ۴۳۹ تا ۴۵۸)

دوطرفہ پیش کیے گئے دلائل میں تیسرے نمبر پر غامدی صاحب کے فریق نے شرائع سابقہ کا سہارا لیا ہے، جبکہ راشدی صاحب نے اس کی بجائے ''اپنے مضمون کی بنا فلسطین، برصغیر پاک وہند، افغانستان اور الجزائر کی جدوجہد آزادی اور ابن تیمیہؒ کی ان کوششوں پر رکھی تھی جو انہوں نے تاتاریوں کے خلاف اہل دمشق میں جہاد کی روح پھونکنے کے لیے کیں'۔ص ۹۰۔

راشدی صاحب کے ان دلائل پر معز امجد صاحب نے ایک پہلو سے بجا نقد کیا ہے کہ ''مولانا محترم جیسے اہل علم سے ہماری توقع یہی ہے کہ وہ اہل علم کے عمل سے شریعت اخذ کرنے کے بجائے، شریعت کی روشنی میں اس عمل کا جائزہ لیں۔ اگر شریعت اسلامی کے بنیادی ماخذوں، یعنی قرآن وسنت میں اس عمل کی بنیاد موجود ہے تو اسے شریعت کے مطابق اور اگر ایسی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے تو بغیر کسی تردّد کے اس سے ہٹا ہوا قرار دیں'۔ص ۹۰۔

غامدی صاحب کے فریق نے اس سلسلہ میں سابقہ انبیاء وکتب بالخاص حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہماالسلام کی سیرتوں جو موجودہ بائبل میں تحریر ہیں، سے بھی استدلال کیا ہے، جیسا کہ معز صاحب لکھتے ہیں: ''تفصیلی قانون سازی کا ماخذ اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبروں کا اسوہ اور ان کی جاری کردہ سنت ہی ہوسکتی ہے''، ص ۵۹۔ مگر راشدی صاحب نے فریقِ مخالف کے اس متدل اور اس سے کیے گئے استدلال پر کوئی بحث نہیں کی، حالانکہ اس پر اصولی بحث کی جانی چاہیے تھی۔

'جہاد اور حکومت و اقتدار' سے متعلقہ مباحث پر زیر نظر کتاب میں دونوں طرف سے قدرے تفصیل سے بات کی گئی ہے، انہی دِنوں تبصرہ نگار نے بھی جناب غامدی صاحب کے اس موقف پر نقد لکھا تھا، اسے ماہنامہ مجلّہ الدعوۃ،۲۰۰۱ء کی فائل میں دیکھا جا سکتا ہے، یا مزید تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب: ''اسلام میں تصور جہاد' کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، یہاں اختصار کے پیش نظر ہم صرف ایک نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہیں گے، معزامجد صاحب نے لکھا ہے:

> ''سب سے پہلی صورت جو ہمارے اور مولانا محترم کے درمیان متفق علیہ ہے، یہ ہے کہ کسی قوم و ملک کے خلاف جارحانہ اقدام اسی صورت میں 'جہاد' کہلانے کا مستحق ہو گا، جب یہ مسلمانوں کی کسی حکومت کی طرف سے ہو گا''۔ص ۶۰۔

جارحانہ اقدام دوسرے لفظوں میں اقدامی جہاد یا مولانا مودودی صاحب کی اصطلاح میں مصلحانہ جہاد کے لیے حکومت کی شرط یقیناً ضروری ہے، قدیم وجدید فقہی لٹریچر میں بھی واضح اور قریب قریب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

متفقہ طور پر اس کی تصریحات موجود ہیں، مگر یہ امر قابل وضاحت ہے کہ اقدام کی بنیاد کیا کچھ ہوسکتی ہے، غامدی صاحب کے بقول اس کی صورت صرف اور صرف یہ ہوسکتی ہے کہ یہ ''ظلم و عدوان کے خلاف ہو''۔ (میزان، اشاعت اپریل ۲۰۰۲ء،ص۲۴۲)، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کہیں ظلم و عدوان نہیں تو وہاں اقدامی جہاد کی کوئی صورت بھی خواہ وہ اقامت دین کے لیے ہو، درست نہیں ہو گی، مگر ہمارا سارا قدیم فقہی لٹریچر اس متفردانہ رائے کو نہیں مانتا۔خود راشدی صاحب کی اس سلسلہ میں کیا رائے ہے، اس کتاب میں وہ اسے زیر بحث نہیں لائے۔

۴۔ علماء اور فتویٰ بازی

اس سلسلہ میں غامدی صاحب کا موقف یہ تھا کہ

''فتووں کا بعض اوقات انتہائی غلط استعمال کیا جاتا ہے اس لیے فتویٰ بازی کو اسلام کی روشنی میں ریاستی قوانین کے تابع بنانا چاہیے''۔ص۱۳۔

راشدی صاحب اس موقف پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جہاں تک اس شکایت کا تعلق ہے کہ ہمارے ہاں بعض فتوؤں کا انتہائی غلط استعمال ہوتا ہے، ہمیں اس سے اتفاق ہے۔ ان فتوؤں کے نتیجے میں جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں، وہ بھی ہمارے سامنے ہیں اور ان خرابیوں کی اصلاح کے لیے غیر سرکاری سطح پر کوئی قابل عمل فارمولا سامنے آتا ہے تو ہمیں اس سے بھی اختلاف نہیں ہو گا۔ مگر کسی چیز کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے سرے سے اس کے وجود کو ختم کر دینے کی تجویز ہماری سمجھ سے بالا تر ہے...... اور فتویٰ تو کہتے ہی ہیں کسی مسئلہ پر غیر سرکاری رائے کو، کیونکہ کسی مسئلہ پر حکومتی انتظامیہ کا کوئی افسر جو فیصلہ دے گا وہ ''حکم'' کہلائے گا اور ''عدالت'' فیصلہ صادر کرے گی تو اسے ''قضا'' کہا جائے گا اور ان دونوں سے ہٹ کر اگر کوئی صاحب علم کسی مسئلے کے بارے میں شرعی طور پر حتمی رائے دے گا تو وہ فتویٰ کہلائے گا۔ امت کا تعامل شروع سے اسی پر چلا آ رہا ہے کہ حکام حکم دیتے ہیں، قاضی حضرات عدالتی فیصلے دیتے ہیں اور علمائے کرام فتویٰ صادر کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ صحابہ کرامؓ کے دور سے چلا آرہا ہے''۔ ص۱۸، ۱۹۔

راشدی صاحب نے غامدی صاحب پر یہاں ایک تعریض بھی کی ہے، لکھتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''ہمارے محترم اور بزرگ دوست جاوید احمد غامدی صاحب اگر ناراض نہ ہوں تو ڈرتے ڈرتے ان سے ایک سوال پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ انہوں نے مختلف گروپوں کی مسلح جدوجہد کے جہاد نہ ہونے، زکوٰۃ کے علاوہ ٹیکس کی ممانعت اور ریاستی نظم سے ہٹ کر فتویٰ کا استحقاق نہ ہونے کے بارے جو ارشادات فرمائے ہیں وہ بھی تو معروف معنوں میں فتویٰ ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں یہ فتوے جاری کرنے کی اتھارٹی کس ریاستی قانون نے دی ہے؟'' ص۲۱۔

۵۔ حدیث و سنت کے بارے میں غامدی صاحب کا نقطہ نظر

حدیث و سنت کے مابین لفظی اور معنوی طور پر فرق کی بحث فقہاء، محدثین اور اصولیین کے ہاں شروع سے رہی ہے۔ لیکن سنت سے دین ابراہیمی کی وہ روایت مراد لینے کہ ''جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا''، اور پھر ان سنتوں کو کم وبیش چالیس کے عدد میں محصور کر دینے کی مثال صرف غامدی صاحب کے ہاں ہی ملتی ہے اور یہ ان کے اصولی تفردات میں سے ایک اہم تفرد ہے۔ زیر نظر کتاب میں اس پہلو پر بھی کچھ بحث ملتی ہے، راشدی صاحب نے اس سلسلہ میں غامدی صاحب کے دو اقتباسات درج کر کے ان پر یہ نقد کیا ہے:

''ہم ان [غامدی صاحب کے] دو اقتباسات سے جو مطلب سمجھ پائے ہیں، وہ یہ ہے کہ سنت صرف وہی ہے جو دین ابراہیمی کے سابقہ تسلسل کے ساتھ نقل ہوتی چلی آ رہی ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ نے تجدید و اصلاح کے ساتھ اسے باقی رکھا ہے۔ اس کا لازمی مطلب اگر سامنے رکھا جائے تو جناب نبی اکرم ﷺ کا ہر وہ عمل اور قول سنت کے دائرہ سے نکل جاتا ہے جس کا دین ابراہیمی کے سابقہ تسلسل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی طرف سے نئی سنت کے طور پر اس کا اجرا فرمایا ہے۔ اسی طرح کسی سنت کے ثبوت کے لیے غامدی صاحب کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد امت کے اجماع اور عملی تواتر سے ثابت ہو، اور جو سنت نبویؐ یا حدیث رسول اجماع اور تواتر کے ذریعہ ہم تک نہیں پہنچی، وہ غامدی صاحب کے نزدیک ثابت شدہ سنت نہیں، لہٰذا اگر حدیث و سنت کے تعین اور ثبوت کے لیے اس معیار کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قبول کر لیا جائے تو چودھری غلام احمد پرویز اور ان کے رفقاء کی طرح حدیث و سنت کے انکار کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی بلکہ اس وقت حدیث و سنت کے نام سے روایات کا جو ذخیرہ امت کے پاس موجود ہے اور جس کی چھان پھٹک کے لیے محدثین تیرہ سو برس سے صبر آزما اور جاں گسل علمی جدوجہد میں مصروف چلے آ رہے ہیں، اس کا کم و بیش نوے فیصد حصہ خود بخود سنت کے دائرے سے نکل کر کالعدم قرار پاتا ہے''۔ ص۳۷۔

راشدی صاحب کا نقد اگرچہ وزنی اور جمہور اہل علم کی ترجمانی کرتا ہے، اور خورشید صاحب اور ان کے بعد ان کے دیگر رفقاء اس سلسلہ میں، پتہ نہیں کیوں اس بحث کو آگے نہیں بڑھا سکے، تاہم یہاں راشدی صاحب نے خبر واحد کی جو تعریف کی ہے، وہ محل نظر ہے۔ راشدی صاحب خبر واحد کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ''محدثین کی اصطلاح میں خبر واحد اسے کہتے ہیں کہ قرون اولیٰ یعنی صحابہ کرامؓ اور تابعین کے دور میں کسی حدیث نبوی کو روایت کرنے میں ایک ہی بزرگ متفرد ہوں اور دوسرا کوئی ان کے ساتھ اس بات کو بیان کرنے میں شریک نہ ہو''۔ص۳۶۔

لیکن یہ تعریف محدثین کے ہاں 'غریب' کی ہے جو خبر آحاد کی اقسام میں سے ایک قسم ہے،ورنہ اخبار آحاد کی دیگر اقسام مثلاً مشہور، مستفیض اور عزیز پر یہ تعریف کسی طور بھی صادق نہیں آتی کیونکہ ان کی اسناد میں کہیں بھی ایک راوی نہیں ہوتا بلکہ ایک سے زیادہ ہی ہوتے ہیں، البتہ اتنے راوی نہیں ہوتے کہ یہ متواتر کے درجہ کو پہنچ جائے۔ اس لیے خبر واحد کی اصطلاحی تعریف بالاتفاق یہ کی جاتی ہے کہ

واما خبر الواحد فهو ما لم يوجد فيه شروط المتواتر سواء كان الراوى له واحدا او اكثر. (قواعد التحديث من فنون مصطلح الحديث، جمال الدين قاسمي، ج١، ص١٢٣)

''یعنی خبرواحد (مصطلح الحدیث کی رو سے) وہ روایت ہے جس میں متواتر کی شرائط جمع نہ ہوں، قطع نظر اس سے کہ اس کا راوی ایک ہے یا ایک سے زیادہ''۔

تکملہ کتاب اور چند مزید مباحث

اس کے بعد 'تکملہ' نمبر۱، اور نمبر۲ کے عنوان کے تحت چھ مضامین مزید شامل اشاعت ہیں، ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غامدی صاحب کے تلمیذ منظور الحسن صاحب کی طرف سے (جس میں انہوں نے غامدی صاحب کا حدود آرڈیننس کے بارے میں موقف تحریر کیا ہے) اور باقی راشدی صاحب کی طرف سے۔ ان میں بھی غامدی صاحب کے نقطۂ نظر پر نقد و محاکمہ کیا گیا ہے۔ پہلے تکملہ میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

۱۔ حدود آرڈیننس اور اس پر اعتراضات (از: زاہد الراشدی)

۲۔ حدود آرڈیننس: جناب جاوید احمد غامدی کا موقف (از: منظور الحسن)

۳۔ محترم جاوید غامدی اور ڈاکٹر طفیل ہاشمی کی توضیحات (از: زاہد الراشدی)

کتاب کے اس حصہ میں راشدی صاحب نے صرف ایک ہی بنیادی اعتراض کیا ہے اور وہ انہی کے الفاظ میں یہ ہے:

> ''حدود آرڈیننس پر معترض حلقوں کے موقف پر اظہار خیال کرتے ہوئے راقم الحروف نے اپنے دو محترم دوستوں، محترم جاوید احمد غامدی اور ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی کا بھی تذکرہ کیا تھا اور اس بات پر دکھ کا اظہار کیا تھا کہ حدود آرڈیننس کے حوالے سے ان حضرات کا جو موقف پبلک کے سامنے آ رہا ہے، وہ ان حلقوں کی تقویت کا باعث بن رہا ہے جو حدودآردینس کی تکنیکی خامیوں یا فقہی کمزوریوں کو دور کرنے کے بجائے سرے سے پاکستان میں شرعی قوانین کے نفاذ ہی کے خلاف ہیں اور اسی وجہ سے وہ حدود آرڈیننس کو منسوخ کرانے کے درپے ہیں''۔ص۱۷۹۔

دوسرے تکملہ میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

۱۔ قرآن فہمی میں حدیث نبویؐ کی اہمیت (از: زاہد الراشدی)

۲۔ اسلام میں پردہ کے احکام (از: زاہد الراشدی)

۳۔ پارلیمنٹ، اجتہاد اور وفاقی شرعی عدالت کے بارے میں غامدی صاحب کے خیالات (از: زاہد الراشدی)

ان تینوں مضامین میں راشدی صاحب نے غامدی صاحب کے افکار کے حوالے سے بعض پہلوؤں پر نقد کیا ہے، غامدی صاحب یا ان کے رفقاء کی طرف سے اس نقد کا کوئی جواب نہیں دیا گیا اور اگر دیا گیا ہے تو راشدی صاحب نے اس کا ذکر نہیں کیا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جواب نہیں دیا گیا ورنہ اس تحریری مکالمہ کے چھ سال بعد کتابی شکل میں شائع ہونے کے موقع پر راشدی صاحب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسے بھی ضرور شامل اشاعت کر لیتے۔

پہلے مضمون میں طلوع اسلام اور خورشید ندیم صاحب کے مابین تفسیر قرآن میں لغت عربی اور ادب جاہلی کے حوالے سے ہونے والی بحث پر راشدی صاحب نے اپنا موقف وتجزیہ پیش کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''خورشید ندیم صاحب نے غلام احمد پرویز صاحب کے فکر پر تنقید کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ وہ قرآن کریم کو صرف لغت کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور قرآن کریم کے مختلف الفاظ کے لغوی معانی اور ان کے پس منظر کو کھنگال کر ان کا مفہوم متعین کرتے ہیں جس سے لغوی تحقیق اور بحث تو ضرور سامنے آتی ہے لیکن قرآن کریم کی منشا اور مراد تک رسائی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے جواب میں طلوع اسلام نے خورشید احمد ندیم کے استاذ محترم جناب جاوید احمد غامدی کے بارے میں یہ کہا ہے کہ وہ قرآن کریم کو جاہلی دور کے عربی ادب اور شعر و شاعری کے ذخیرے کی بنیاد پر سمجھنا چاہتے ہیں اور ادب جاہلی کی روایات کے حوالے سے قرآن کا مفہوم طے کرنے کے درپے ہیں جس سے قرآن کریم کی منشا اور مراد کی صحیح طور پر وضاحت نہیں ہو پاتی''۔ص۱۸۵۔

اس پر راشدی صاحب فرماتے ہیں:

''جو بات خورشید ندیم صاحب نے غلام احمد پرویز کے بارے میں کہی ہے، میں اسے بھی صحیح سمجھتا ہوں اور جو تبصرہ طلوع اسلام نے غامدی صاحب کے فکر پر کیا ہے، وہ بھی خلاف واقعہ نہیں ہے۔ جہاں تک فہم قرآن کریم کے بنیادی تقاضوں کا تعلق ہے، اگرچہ لغت اور ادب جاہلی دونوں اس کی ضروریات میں سے ہیں، لیکن فہم قرآن کریم کا انحصار ان دونوں پر یا ان میں سے کسی ایک پر نہیں ہے۔ یہ دونوں صرف معاون ہیں اور فہم قرآن تک رسائی کے ذرائع میں سے ہیں، لیکن اس کی اصل نبیاد جس چیز پر ہے، اسے دونوں حضرات فہم قرآن کریم کی بنیاد کے طور پر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔'' ص۱۸۶۔

اور وہ بنیاد حدیث نبویؐ ہے، چنانچہ راشدی صاحب لکھتے ہیں: ''یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ تک ہماری رسائی نہیں ہے اور قرآن کریم کے کسی لفظ یا اس کے جملے کے بارے میں ہم اللہ رب العزت سے یہ دریافت نہیں کر سکتے کہ اس سے آپ کی مراد کیا ہے یا اس کے جو مختلف مفہوم سمجھے جا رہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، ان میں سے کون سا مفہوم آپ کی منشا کے زیادہ قریب ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے نمائندے تک تو ہمیں رسائی حاصل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے جس نمائندے نے ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کریم کا متن عطا فرمایا ہے، اسی نمائندے نے اس کی تشریح بھی کی ہے اور اس کے اکثر وبیشتر مقامات کی وضاحت بھی اپنے ارشادات، اَعمال اور اسوۂ حسنہ کے ذریعے سے کر دی ہے''۔ص۱۸۷۔

پھر حدیثِ نبویؐ کے ثبوت و استناد کے حوالے سے غلام احمد پرویز اور جاوید احمد غامدی اور ان دونوں مکاتب فکر سے وابستہ افراد پر تنقید کرتے ہوئے راشدی صاحب لکھتے ہیں:

'' قرآن کریم امت تک جن ذرائع سے پہنچا ہے، وہی ذرائع اس کی تشریح میں جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات و فرمودات کو ہم تک منتقل کر رہے ہیں۔ اگر وہ ذرائع قرآن کریم کو امت تک منتقل کرنے میں قابل اعتماد ہیں تو حدیث و سنت کو امت تک پہنچانے میں کیوں قابل اعتماد نہیں ہیں...... ہمارے مہربان فرماتے ہیں کہ قرآن کریم چونکہ تواتر کے ذریعے سے ہم تک پہنچا ہے، اس لیے وہ شک و شبہ سے بالا تر ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تواتر کن لوگوں کا ہے اور کون سے افراد اس تواتر میں شامل ہیں؟ کیا یہ تواتر احادیث وسنن روایت کرنے والوں سے الگ لوگوں کا ہے؟ اور اگر یہ وہی لوگ ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اکٹھے ہوں تو اعتبار اور اعتماد کی سند سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور الگ الگ ہو جائیں تو اس سند سے محروم ہو جاتے ہیں؟ یہ گورکھ دھندہ ہماری سمجھ سے بالا تر ہے مگر پرویز صاحب اور غامدی صاحب دونوں اپنے تمام تر اختلاف کے باوجود اس بات پر متفق ہیں کہ حدیث نبویؐ کو قرآن کریم کی حتمی تشریح کا درجہ حاصل نہیں ہے''۔ص۱۸۸۔

یہاں اس امر کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ جناب جاوید احمد غامدی صاحب کی طرف سے غلام احمد پرویز پر لغت سے قرآنی تفسیر کے لیے اختیار کیے گئے منہج پر جو اعتراض کیے گئے ہیں، وہ بہت وزنی ہیں۔ ان کے یہ اعتراضات 'فکر پرویز' کے نام سے آڈیو کیسٹ اور کتابچہ کی شکل میں دستیاب ہیں۔ خود غامدی صاحب کے ہاں لغت کے بنیاد پر جو استدلال اور تفسیر کی جاتی ہے، وہ پرویز صاحب کے برخلاف، بالعموم انہی ضوابط کے تحت ہوتی ہے جو کسی بھی زبان سے فہم واستدلال کے سلسلہ میں مسلمہ حیثیت رکھتے ہیں، تاہم غامدی صاحب سے اس سلسلہ میں اختلاف اس بنیاد پر کیا جا سکتا ہے اور فی الواقع کیا گیا ہے کہ انہوں نے لغت و ادب جاہلی سے استشہاد و استدلال کرتے وقت اسے تفسیر قرآن کا داخلی ماخذ اور احادیث کو خارجی ماخذ قرار دیا ہے اور پھر ان دونوں مآخذ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعارض کی صورت میں ظاہر ہے، داخلی ماخذ کو خارجی پر فوقیت دے دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اس سلسلہ میں ان کے ہاں ذخیرۂ احادیث، اسرائیلیات (سابقہ صحائف) اور تاریخی روایات تینوں ایک ہی درجہ میں تفسیر قرآن کے خارجی مآخذ کی حیثیت دیئے گئے ہیں۔ اگر تفسیر قرآن میں کسی مقام پر ایک طرف بائبل کا بیان ان کے فہم میں قرآنی بیان سے مطابقت رکھتا دکھائی دے اور دوسری طرف بخاری ومسلم وغیرہ کی روایات میں اس کے برخلاف معلوم ہو تو ایسی صورت میں ان کے ہاں بائبل کا بیان قابل ترجیح ہو گا اور نتیجتاً قرآنی تفسیر کے صرف اسی پہلو کو، دیگر پہلوؤں کی نسبت، نہ صرف فوقیت ہو گی بلکہ یہی پہلو درست قرار پائے گا۔

علاوہ ازیں غامدی صاحب کے ساتھ زیر بحث موضوع میں اختلاف کی ایک اور بڑی وجہ 'نظم قرآن' کو فوائد کے درجہ سے بڑھا کر تفسیر قرآن کے (ان کی اصطلاح میں داخلی) مآخذ میں سے ایک ماخذ قرار دے دینا بھی ہے۔ کیا متقدم مفسرین کے ہاں بھی 'نظم قرآن' کی کبھی یہ حیثیت رہی ہے کہ اسے 'فوائد' کی بجائے 'اصل' قرار دیا گیا ہو؟ ہماری رائے میں اس کا جواب نفی میں ہے۔ مزید تفصیل راقم الحروف کے مقالہ (تفسیر میں نظم قرآن کی استدلالی حیثیت، شائع شدہ در: تحقیقات اسلامی، ج۲۶، ش۳، جولائی۔ستمبر، ش۴، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۷ء) کی طرف مراجعت مفید ہو گی۔

دوسرے مضمون یعنی :'اسلام میں پردہ کے احکام' میں راشدی صاحب نے غامدی صاحب کے اس نقطۂ نظر کا جائزہ لیا ہے کہ 'دوپٹہ کا تعلق کلچر سے ہے، شریعت سے نہیں'۔ راشدی صاحب کے بقول اس کا تعلق شریعت سے ہے، اس لیے کہ علاقائی کلچر کے سلسلہ میں ''جن اقدار و روایات کو شریعت کے احکام و قوانین میں شامل کر لیا گیا ہے اور ان کا ذکر قرآن کریم یا سنت رسول ﷺ میں موجود ہے، وہ شریعت کا حصہ بن گئی ہیں، انہیں کلچر کا حصہ قرار دے کر شریعت سے الگ کرنا انصاف کی بات نہیں ہے۔ البتہ جن امور کو صرف خاموشی کے ساتھ گوارا کیا گیا ہے، ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ عرب کلچر کی بات نہیں ، بلکہ دنیا کے کسی بھی کلچر اور ثقافت کی وہ روایات و اقدار جن کی نفی قرآن و سنت میں موجود نہیں ہے اور مسلمہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں انہیں گوارا کیا جا سکتا ہے، وہ کلچر اور ثقافت کے نام پر اسلام کے ساتھ ساتھ چلتی رہیں گی''۔ ص۱۹۲۔

تیسرے مضمون یعنی: 'پارلیمنٹ، اجتہاد اور وفاقی شرعی عدالت کے بارے میں غامدی صاحب کے خیالات' میں زاہد الراشدی صاحب نے غامدی صاحب کے اس بیان کو ہدفِ تنقید بنایا ہے:

''یہ وفاقی شرعی عدالت کیا چیز ہے؟ کیا حق ہے کسی عدالت کو کہ وہ قانون کے معاملات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا فیصلہ کر کے کسی قوم کے لیے قانون سازی کرے؟ عدالتوں کا کام جو قانون سازی کی گئی ہو، اس کی تعبیر کرنا ہے اور اس کا نفاذ کرنا ہے، یعنی عدالتوں کا کام قانون کا نفاذ ہے نہ کہ قانون سازی۔ قانون سازی کا حق صرف پارلیمنٹ کو ہے''۔ص۱۹۷۔

غامدی صاحب کے اس بیان پر راشدی صاحب نے یہ تبصرہ کیا ہے:

''ہمارے خیال میں معروضی حقائق غامدی صاحب کے ان ارشادات کی تائید نہیں کرتے، اس لیے کہ کسی بھی ملک کی عدالت عظمیٰ کا کام صرف نفاذ اور تعبیر نہیں ہوتا بلکہ یہ چیک کرنا بھی عدالت ہی کے دائرہ اختیار میں ہوتا ہے کہ ملک کی پارلیمنٹ دستور کے اصولوں سے تو انحراف نہیں کر رہی؟ پارلیمنٹ کو دستور میں ترمیم کا اختیار ہوتا ہے، لیکن جب تک ترمیم نہیں ہو جاتی، وہ خود بھی دستور کے دائرے میں رہنے کی پابند ہوتی ہے اور اگر وہ اپنے کسی فیصلے یا قانون سازی میں دستور کی بنیادوں سے منحرف نظر آ رہی ہو تو نہ صرف عدالت عظمی کو اس کا نوٹس لینے کا حق ہے بلکہ کسی بھی شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ پارلیمنٹ کو دستور کے اصولوں کا پابند رکھنے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔ ......

باقی رہی بات ''وفاقی شرعی عدالت'' کی تو سچی بات ہے ، ہمیں محترم جاوید احمد غامدی صاحب سے اس ''تجاہل عارفانہ'' کی توقع نہیں تھی، کیونکہ اس کے پس منظر سے وہ یقیناً آگاہ ہیں کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور میں قانون سازی کی بنیاد قرآن وسنت کو قرار دیا گیا ہے جبکہ قانون کی تعبیر و تشریح اور قانون سازی میں اس کے اصولوں کی پاسداری کو چیک کرنا اعلیٰ عدالتوں کا کام ہے، لیکن ہمارے ہاں مروجہ سسٹم میں اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان کے لیے قرآن و سنت کا علم اور مہارت اس درجے میں شرط نہیں ہے جو قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح اور ان کی روشنی میں قوانین کا جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے۔ اس خلا کو پر کرنے اور ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ''وفاقی شرعی عدالت'' اور سپریم کورٹ میں ''شریعت اپیلٹ بنچ'' کا قیام عمل میں لایا گیا تھا کہ قرآن وسنت کی روشنی میں قوانین کا جائزہ لینے کے لیے جج صاحبان کے ساتھ قرآن و سنت کی مطلوبہ مہارت رکھنے والے علمائے کرام بھی بیٹھیں تاکہ دونوں مل کر دستور میں دی گئی اس ضمانت پر عمل درآمد کی نگرانی کر سکیں کہ ملک میں قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔ جس طرح سپریم کورٹ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی قانون کو دستور کے اصولوں کے منافی سمجھے تو اسے کالعدم قرار دے دے، اسی طرح وفاقی شرعی عدالت کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

> یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ کسی قانون کو قرآن و سنت کے منافی دیکھے تو اس کے خلاف حکم جاری کر دے۔ اسے اگر جاوید احمد غامدی صاحب پارلیمنٹ کے متوازی قانون سمجھتے ہیں تو ان کی مرضی ہے، ورنہ معروضی صورت حال ان کے اس ارشاد کی موافقت نہیں کرتی''۔ص ۱۹۸۔

زیر تبصرہ کتاب کے فکری مباحث اتنے دلچسپ ہیں کہ جب تک ایک ہی نشست میں کتاب ختم نہ ہو جائے، چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ کتابت میں غلطی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے جس پر راشدی صاحب کی اکیڈمی، جس نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا، مبارک باد کی مستحق ہے۔ راشدی صاحب کے لیے بھی تحسین آفرین ہے کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود تن تنہا فریق مخالف کے سبھی شرکاء کے نقطۂ نظر و اَدلہ پر نہایت خوشگوار علمی اسلوب کے ساتھ نقد و محاکمہ کا سلسلہ جاری رکھا۔

......☆......

© rasailojaraid.com